ڈاکٹر نصیر احمد ناصر

ثقافت اور احترامِ ثقافت

ثقافت کی اصطلاح ہماری زبان میں انگریزی کی اصطلاح کلچر کے مترادف کے طور پر استعمال ہوتی ہے۔ اور ہر پڑھا لکھا شخص یہ سمجھتا ہے کہ وہ اس کے مفہوم سے آشنا ہے لیکن اس کے معنی و مفہوم کے تعین میں بڑا اختلاف پایا جاتا ہے۔ ثقافت بھی ہر زندہ چیز کی طرح حرکی و تغیر پذیر ہے اور زندگی کے ہر مظہر کی طرح وہ یا تو ارتقائی حالت میں ہوتی ہے یا رو بہ تنزل۔ اس کا کسی ایک مقام یا ایک حالت پر رہنا محال ہے۔ اس اہم سوال کا کہ حیاتِ انسانی کے ارتقا کا حاصل کیا ہے؟ صرف چند الفاظ میں یہ جواب دیا جا سکتا ہے کہ وہ ثقافت ہے۔ زندگی کی حقیقت، حسن۔ اس کی فطرت، آرزوئے حسن اور اس کا تقاضا، اظہارِ حسن ہے اور زندگی جب اپنے اس فطری تقاضے کی تشفی حسین و شعوری انداز میں کرتی ہے تو اسے ثقافت سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس اعتبار سے ثقافت کل حیاتِ انسانی کو محیط ہے اور جمالیات سے گہرا تعلق رکھتی ہے۔

ثقافت کی تعریف کے ساتھ ہی جو اہم سوال پیدا ہوتا ہے وہ ثقافت کے تحفظ و احترام کا مسئلہ ہے۔ اس ضمن میں ہمارے لیے سب سے اہم سوال یہ ہے کہ ہم کس ثقافت کا احترام کریں؟ اس ثقافت کا جو اپنی روحِ حیات اور حسن سے محروم ہو چکی ہے یا اس ثقافت کا احترام کریں جس کی داغ بیل پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے حجاز کی سرزمین میں ڈالی تھی؟ ہمارے ملک میں بعض دانشور ایسے بھی ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ ہماری ثقافت پاکستانی ہونی چاہیے اور پاکستانی ثقافت سے ان کی مراد موہنجوداڑو، ہڑپہ، ٹیکسلا وغیرہ کی قدیم مقہور و مغضوب اور مشرک و بت پرست اقوام کی مردہ ثقافت ہے۔ اصل یہ ہے کہ ہم مسلمان و حق پرست اور موحد و بت شکن ہیں۔ لہٰذا ہماری ثقافت نہ تو مشرک و بت پرست اقوام کی ثقافت ہو سکتی ہے نہ دہریت و باطل پرست اقوام کی۔ ہماری ثقافت یہ بھی نہیں جو ہمیں انگریز کی غلامی کے دور میں ملی ہے۔ بلکہ ہماری ثقافت تو وہ ہے جس

کا سرچشمہ قرآن حکیم ہے اور جس کی بنیاد آخری پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد نبوی میں رکھی تھی جو حجاز کی مقدس سرزمین میں پروان چڑھی اور توحید و رسالت، حسن و صداقت اور علم و حکمت کی انقلاب انگیز تحریک بن کر افصائے عالم میں پھیل گئی ۔

کسی قوم کے دینی معتقدات اس کی ثقافت کی اساس ہوتے ہیں اور ثقافت اس قوم کے جمالیاتی شعور کی آئینہ دار ہوتی ہے ۔ چنانچہ ہماری ثقافت کا مبدا بھی ہمارا دینِ اسلام ہے جو فطرتِ انسانی کے عین مطابق ہونے کی بنا پر دینِ فطرت کہلاتا ہے ۔ اس اعتبار سے اسلام ایک ایسی ثقافتی تحریک بھی ہے جو کل زندگی کو محیط ہے ۔ یہ ایک جامع و مانع ضابطۂ حیات ہے جو زندگی کے ہر شعبہ میں افرادِ نسلِ انسانی کو ارتقائے مسلسل کی طرف رہنمائی کرتا ہے ۔ جمالیاتی یا ثقافتی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو تحریکِ اسلام کا ایک مقصد "حسن آفرینی" بھی ہے ۔ فکر و عمل کے ہر گوشے میں حسن آفرینی ۔ تاکہ انسان کے معروضی و موضوعی دونوں قسم کے ماحول کو حسین و سرود انگیز بنا سکے ۔ چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ اسلام کی یہ تحریک عرب کے اس خطے سے اُٹھی جو ثقافت کے لحاظ سے روم و چین، مصر و فارس اور یونان و ہند سے بلاشبہ بہت پیچھے تھا ۔ لیکن اس تحریک کی بدولت یہ خطہ چند ہی برسوں میں دنیا بھر کے لیے حسن ثقافت کا مشعل بردار بن گیا ۔

ثقافت بھی ہر زندہ چیز کی طرح حرکی و تغیر پذیر ہے اور اسے کسی حال میں بھی ثبات نہیں ۔ زندگی کے ہر مظہر کی طرح وہ یا تو ارتقائی حالت میں ہوتی ہے یا رو بہ تنزل ۔ اس کا کسی ایک مقام یا حالت پر رہنا محال ہے ۔ کیونکہ :

ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

حیاتِ انسانی کے ارتقا کا حاصل کیا ہے؟ اس از بس اہم سوال کا جواب ایک فقرہ میں دیا جا سکتا ہے کہ وہ انسانی تہذیب و ثقافت ہے ۔

ثقافت بھی زندگی کی طرح حرکی ہے ۔ اور اس کی روایات کو متاعِ عزیز سمجھ کر اپنائے رکھنا نہایت ضروری ہے ۔ اس کے ساتھ ہی اس کی اصل کا جو اصلِ شجر کی طرح ہے تحفظ و احترام کرنا اور اسے پھیلنے پھولنے میں مدد دینا بھی ہم پر واجب ہے ۔

اسلامی ثقافت کے تشکیلی عناصر

وہ عناصر جو نظامِ ثقافت کی تشکیل کرتے ہیں بلحاظِ تعداد کثیر ہیں۔ لیکن جہاں تک اسلامی یا مثالی ثقافت کا تعلق ہے ان میں سات بنیادی حیثیت رکھتے ہیں اور وہ یہ ہیں: ۱۔ توحید ۲۔ رسالت ۳۔ حسن ۴۔ اجتہاد ۵۔ صداقت ۶۔ فن ۷۔ اور علم و حکمت۔

توحید

توحید ایک حسین تصور، دین کا بنیادی عقیدہ اور اسلامی ثقافت کی روح ہے اور جب اس عقیدے کا عملاً اظہار ہوتا ہے تو یہ ثقافت کا اہم ترین عنصر بنتا ہے۔

توحید کا حسین ترین مظہر "الصلوٰۃ" یا نماز ہے۔ نماز خودی کے اعترافِ عبودیت اور اقرارِ معبودیت کی بڑی ہی موزوں شکل ہے۔ یہ دونوں مقام بلحاظِ حسن و موزونی بے مثال ہیں۔ مقامِ معبودیت اس لیے جمال و جلال میں بے مثال ہے کہ وہ حسن حقیقی کی جلوہ گاہ ہے اور مقامِ عبودیت اس لیے حسن میں بے نظیر ہے کہ وہ بندے کے لیے موزوں ترین مقام ہے۔ یہ دونوں مقامات اسلامی ثقافت میں از بس اہمیت رکھتے ہیں اور ان دونوں کے احترام ہی میں ایمان کی حقیقت مضمر ہے۔ ایمان جیسا کہ آپ جانتے ہیں اصلِ دین ہے۔ ایمان چونکہ خودی کی زندہ و حرکی قوّتِ تسخیر ہے۔ اس لیے افرادِ نسلِ انسانی کی بقا اور ترقی کا انحصار اس پر ہوتا ہے۔ ایمان نہ ہو تو خودی مردہ اور ایمان ضعیف ہو تو خودی بھی ناتواں ہوتی ہے۔ اس نظریہ کا اطلاق قوم پر بھی ہوتا ہے

توحید اسلامی ثقافت کا بنیادی عنصر ہے۔ اس کے دو مقام ہیں: مقامِ معبودیت اور مقامِ عبودیت، اور ان دونوں کے احترام میں ایمان کی حقیقت مضمر ہے۔ لہٰذا ان دونوں مقامات کا احترام ہر اس شخص پر فرض ہے جو اسلامی معاشرے کا فرد ہے۔

توحید جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں "حسن حقیقی کی یکتائی و وحدانیت کا حسن اعتراف و اظہار ہے جس کا حسین ترین مظہر مسجد ہے۔ مسجد جیسا کہ تاریخ سے ثابت ہے ہماری ثقافت کا سرچشمہ ہے۔ اسلامی ثقافت کی یہ امتیازی خصوصیت ہے کہ وہ مسجد میں پیدا ہوئی، مسجد میں پھلی پھولی اور جوان ہوئی۔ مسجد ہی اس کی حسین و تخلیقی سرگرمیوں کی جولانگاہ تھی۔ مسجد ہی میں ثقافت نے علم و حکمت کے جواہرِ نایاب سے اپنے آپ کو آراستہ کیا۔ مسجد ہی میں، وہ "حسنِ دوست" کے ذکر سے جوشِ حیات

تحریکِ عمل اور رشد و ہدایت حاصل کرتی رہی ہے۔ ثقافت بلاشبہ مسجد کے باہر اسلامی معاشرے کے ہر گوشے میں جلوہ افروز ہوئی لیکن مسجد ہی اس کا حسن مآب رہا ہے۔ قرونِ اولیٰ میں یہ قابلِ رشک اور مثالی ثقافت تھی لیکن اسے تاریخ کی قوت تسخیر سے منسوب کیجیے یا اپنے ظلم و جہل سے کہ اسے رفتہ رفتہ ثقافت کو اس کے حسنِ مآب یعنی مسجد سے نکال کر ہوا و ہوس کے مختلف صنم کدوں میں مقید کر دیا اور اس پر اس کے حسنِ مآب کے دروازے ایسے بند کر دیے کہ صدیاں ہونے کو آئیں مگر کھلتے ہی نہیں۔ کھلیں کیسے؟ ہم جب تک خود اپنے آپ کو اغیار کی ثقافت کے دامِ ہمرنگِ زمین سے نہیں چھڑائیں گے اور ہم میں اپنی ثقافت بالخصوص سرچشمہ ثقافت یعنی مسجد کا احترام نہیں پیدا ہوگا۔ ہماری ثقافت پر مسجد کے دروازے نہیں کھل سکتے اور جب تک مسجد و ثقافت کا باہمی رشتہ استوار نہیں ہوتا، ہماری ثقافت میں توحید کی روحِ حیات پیدا نہیں ہو سکتی اور وہ زندہ و توانا اور حسین و ارتقائی نہیں ہو سکتی۔ یہ مبالغہ نہیں حقیقت ہے کہ ہم میں اپنی ثقافت کا احترام اس لیے نہیں رہا کہ ہم مسجد کا وہ احترام نہیں کرتے جس کی وہ مستحق ہے۔

اسلامی ثقافت کی روحِ حیات یعنی توحید کے دیگر مظاہر میں سے دو بڑے ہی حسین و دلکش وہ ہیں جنھیں عید الفطر اور عید اضحیٰ سے تعبیر کرتے ہیں۔ لہٰذا عیدین کا احترام کرنا بھی ہمارا حسین و مقدس فریضہ ہے۔ جمالیاتی نقطہ نظر سے عید الفطر اگر جمال کا مظہر ہے تو عیدِ قربان جلال کا۔ عید الفطر اگر ثمرہ ہے ماہِ صیام کے روزوں کا تو عیدِ قربان حاصل ہے "مقامِ کبریا" کے طوافِ عام اور اس کی بارگاہِ عام میں اجتماعی حاضری و حضوری کا، جسے حج کہتے ہیں۔ روزہ اگر نفس کا تزکیہ و تصفیہ کر کے اسے حسین و سعید بناتا ہے تو حج سے مومن کو "حضوری" کی وہ لذّت نصیب ہوتی ہے جو محسوس تو ہوتی ہے مگر بیان نہیں ہو سکتی۔

عید الفطر کے احترام کی اصل حقیقت اس امر میں مضمر ہے کہ ہم پہلے ماہِ صیام کا ایسا احترام کریں جو اس کا حق ہے۔ مثلاً اس ماہِ مبارک کے تمام روزے رکھیں، سحری و افطاری کا حتی المقدور اہتمام کریں۔ روزہ رکھ کر ہمیشہ سچ بولیں اور حسین عمل کریں، نیز ظلم و شرک، جرم و نگاہ، شر و فساد لہو و لہب اور ہر قسم کی یاوہ گوئی، بے مقصد بحث و تمحیص، منفی و تخریبی کارروائیوں سے پرہیز کریں۔ علاوہ بریں ان مبارک ایام میں ذکر ہو تو "حسنِ دوست" کا، زبان کھلے تو دوست کی ثنا اور تشکر کے

لیے، ہم مطالعہ کریں تو "پیامِ دوست" کا جسے قرآن مجید کہتے ہیں۔ ہماری توجہ کا مرکز ہو تو "حسنِ کتاب"، جو علم و حکمت بھی ہے اور آیاتِ الٰہی بھی، لوحِ محفوظ بھی ہے اور قلبِ انسانی بھی۔

احترامِ عید الفطر کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ ہم عید کی خوشی اسی طرح منائیں جس طرح حضورِ رسالت مآب اور آپ کے صحابہ کرامؓ مناتے تھے۔ وہ اپنی مسرتوں کو لامحدود کرنے کے لیے ان میں تمام افرادِ معاشرہ کو شریک کرتے تھے، پھر اپنے حسین و مطہر قلوب کی طرح اپنے جسم و لباس کو بھی پاک و صاف کرتے، خوشبو میں بساتے۔ آبادی کی تنگناؤں سے نکل کر کھلی فضا میں اپنے معبودِ حقیقی اور ربِّ رحیم کے حضور سربسجدہ ہو جاتے۔ روزوں کی حلاوت و سعادت کے ساتھ جب انھیں عید کی اجتماعی مسرت اور "حضوریٔ عام" کی لذت نصیب ہوتی تو وہ فرطِ جذبات سے ایک دوسرے کو گلے لگاتے، مصافحہ کرتے اور عید مبارک کے دعائیہ نغموں سے فضا معمور ہو جاتی۔

اسی طرح عیدِ قربان کے احترام کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں حج کی غیر معمولی اہمیت کا احساس و شعور ہو اور وہ خوش نصیب جو زادِ راہ رکھتے ہوں، وہ دیارِ حبیب میں حج کرنے جائیں، "جلوہ گاہِ حسن" کا، جسے کعبہ کہتے ہیں، والہانہ طواف کریں اور وہ لذتِ جنون پائیں جو انسان کو صاحبِ سرود و جنون بناتی ہے۔ یہ جنون ہی اصلِ عشق ہے جس میں ایمان کی حقیقت مظہر ہے۔ لہٰذا:

اگر ہو عشق، تو ہے کفر بھی مسلمانی
نہ ہو تو مردِ مسلمان بھی کافر و زندیق

یہ جنونِ عشق ہی تو ہے جو بڑے بڑے اہلِ علم و دانش، اہلِ مال و دولت، اہلِ حل و عقد اور بڑے بڑے سلاطین کو ننگے سر، برہنہ پا، کفن بدوش کشاں کشاں دیارِ دوست کے اس حسین و منور ریگ زار میں لے جاتا ہے جسے میدانِ عرفات کہتے ہیں اور وہ والہانہ انداز میں یہ کہتے پھرتے ہیں: اللّٰھمّ لبیک لا شریک لک ان الحمد و النعمۃ لک (الحدیث)۔ اے اللہ تعالیٰ ہم تیرے حضور حاضر ہوتے ہیں، تیرا کوئی شریک نہیں، بلاشبہ حمد و ثنا اور نعمت تیرے لیے ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ کلمہ اصلِ توحید ہے۔ جس سے شجرِ ایمان کی شاخیں پھوٹتی اور کل عرصۂ حیات کو اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیتی ہیں۔ یہ کلمۂ طیب و حسین دل کی گہرائیوں میں جاگزین ہو جائے تو انسان کی عظمت و رفعت کا وہ "مقامِ محمود" عطا ہوتا ہے جو معراجِ انسانیت سے عبارت ہے۔ معراجِ انسانیت کیا ہے؟ اجتماعی لحاظ سے ثقافت کا منتہائے

کمال اور انفرادی اعتبار سے مقامِ قرب و حضوری۔

رسالت

ثقافت کا دوسرا عنصر رسالت ہے۔ اس کا مطلب ہے افرادِ نسلِ انسانی کو ان کے "اِلٰہ" یعنی معبود و محبوب اور مطلوب و مقصود کا پیغام پہنچانا۔ اس کے معانی و مفہوم سے انھیں آگاہ کرنا، اس کی عملی تفسیر کرنا اور ہر گوشۂ حیات میں ان کی رہنمائی کرنا۔ اِدھر عقلِ انسانی وحی و تنزیل کی روشنی اور رُشد و ہدایت اور رسالت کی تربیت و رہنمائی کی بدولت پختہ و رسا ہو چکی تھی، اُدھر رسالتِ آخر "رحمۃ اللعالمین" بن کر آئی اور اپنے ساتھ دوست کا آخری زندۂ جاوید پیغام لائی اور اس نے اس پیغامِ ابدی کی عملی تفسیر کا ایسا مثالی نمونہ پیش کیا جو سراپا موزونی و تعدیل، حسن و حق اور رحمت و محبت ہونے کی بنا پر زمان و مکان کی قیود سے ماورا تھا۔ اس اعتبار سے یہ ایسا مثالی نمونہ تھا جس سے عقلِ انسانی ہر زمانے اور ہر خطۂ زمین میں قیامت تک مستفید ہو سکتی تھی۔ چونکہ ایسے عالمگیر و ہمہ گیر اور ابدی و مثالی نمونے کے ہوتے ہوئے کسی اور نمونے کی کسی اعتبار سے بھی قطعاً کوئی ضرورت نہ تھی، لہٰذا ربِّ علیم و حکیم نے رسالت و نبوت کا سلسلہ ہمیشہ کے لیے منقطع کر دیا۔ اور رسالت کی ذمہ داریاں اب ایک فردِ بشر کے بجائے کلِ عقلِ انسانی یا علم و حکمت کو تفویض کر دیں۔ اس اعتبار سے رسالت کی ذمہ داریوں کے وارث اہلِ علم و دانش یعنی علما ہوئے۔

رسالت و نبوت کا دروازہ بند کر دینے میں دوسری حکمت یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے چونکہ اپنے آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو علم و حکمت کی ایک حسین و منور اور زندہ جاوید کتاب دے کر بھیجا تھا۔ اس لیے اس کی موجودگیِ مدام میں نہ مزید وحی و تنزیل کی ضرورت تھی نہ رسالت کی۔

بہر حال رسالت ہماری ثقافت کا ایک بنیادی عنصر ہے اس لیے اس کا احترام ہم پر فرض ہے۔ احترامِ رسالت کی متعدد شرائط میں سے چند ایک یہ ہیں:

اوّلاً، رسالت کو بنی نوعِ انسان کے لیے رشد و ہدایت اور فلاح و نجات کا ناگزیر ذریعہ سمجھنا۔

ثانیاً، رسالت کو مہبطِ وحی و تنزیل سمجھ کر اسے اپنا مُرشد و رہنما بنانا اور اس کی پیروی کرنا۔

ثالثاً، عقل کو رسالت کے تابع سمجھنا اور رکھنا، یعنی عقل کا وحی و تنزیل کی روشنی اور رسول علیہ السلام کی سنتِ حسنہ کے مطابق عمل کرنا اور اس طرح فکری اور عملی طور سے لادینی عقلیت یعنی SECULAR —

RATIONALISM ، دہریت اور عقیدۂ انکارِ رسالت یعنی DEISM کا بطلان کرنا۔

رابعاً، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت رحمۃ اللعالمینی پر ایمان لانا اور اسے سلسلۂ رسالت کی انتہا سمجھنا یعنی ختمِ نبوّت پر ایمان رکھنا۔

رسالتِ آخر تحریک رحمۃ اللعالمینی ہے یعنی وہ نوعِ انسانی بلکہ کُل مخلوقات کے لیے ہمدردی و رحمت اور شفقت و محبت کا پیام ہے۔ یہ تحریکِ رحمۃ للعالمینی اسلامی ثقافت کی روح ہے ظاہر ہے جس طرح روح کے بغیر پیکرِ ہستی مُردہ و بے جان ہوتا ہے۔ اسی طرح روحِ رحمۃ للعالمینی کے بغیر ثقافت مردہ و بے جان ہوتی ہے۔ ہماری ثقافت کی مرگِ مسلسل کا ایک بنیادی سبب یہ بھی ہے کہ وہ روحِ رحمۃ العالمینی سے محروم ہے۔ احترامِ ثقافت کا تقاضا یہ ہے کہ ہم رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تحریکِ رحمۃ للعالمینی کو زندہ کریں اور پھر اس کی روح سے اپنی ثقافت کو تابندہ کریں اور اسے حرکی طاقت بنائیں۔

حُسن

ثقافت کا تیسرا عنصر حسن ہے۔ حسن ثقافت کی روح بھی ہے اور جسم بھی۔ عربی کے ائمہ لغت نے حسن کے جو معانی لکھے ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ سرور انگیز اور پسندیدہ چیز کو حسین کہا جاتا ہے۔ قرآن حکیم کی رُو سے حسن ہیں جمال و جلال کے علاوہ طہارت، حیا، تقدس، پاکیزگی، نیکی، حق و صداقت اور احسان و حسنہ کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے۔ اس بنا پر جب ہم کہتے ہیں کہ حسن ثقافت کا عنصر ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہماری ثقافت جمال و جلال، طہارت و پاکیزگی، حیا و تقدس، حق و صداقت اور احسان و حسنہ کے مظاہر کی آئینہ دار ہونی چاہیے۔

ایک حدیث طیبّہ کی رُو سے حسن کے تین بہترین نمونے یہ ہیں: عورت، خوشبو اور نماز۔ حُسنِ مجسم، پیغمبرِ آخر صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے: مجھے تمھاری دنیا کی تین چیزیں پسند ہیں۔ عورت، خوشبو اور نماز، جو میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔ علمائے جمالیات، اہلِ ذوق اور اہلِ صدق و صفا اس حقیقت سے آشنا ہیں کہ یہ تینوں جمالیاتی اشیا یا OBJECTS OF BEAUTY جمالیاتی حس اور جمالیاتی ذوق کی تسکین کا بہترین سامان ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان تینوں جمالیاتی اشیا کی اسلامی ثقافت میں بڑی اہمیت رہی ہے۔

صنفِ نازک مرد کے جمالیاتی ذوق کی تسکین کا سامان ہے۔ اور اسی کی بدولت اسے طمانیت

محبّت ملتی ہے۔ غور سے دیکھیں تو یہ طمانیتِ دل ہے جو انسان کو فحاشی اور سیاہ کاریوں سے بچاتی اور معاشرے میں امن وسلامتی کی ضامن ہے۔ اسی طرح یہ محبّت ہے جو انسان کو سوز وساز عطا کرکے اسے سرگرمِ عمل رکھتی ہے۔ یہ محبت بھرے دل ہی ہیں جن میں احسان و رحمت کے سوتے پھوٹتے اور گلستانِ ثقافت کو سرسبز و شاداب رکھتے ہیں۔ لیکن اسلام کی نظر میں وہی عورت حُسنِ ثقافت ہے جس کا حسن رنگِ نسوانیت سے مزین ہو اور نسوانیت کو ایک لفظ میں بیان کرنا ہو تو وہ "حیا" ہے۔ حیا کیا ہے؟ یہ عورت کی عفّت وعصمت اور طہارت وپاکیزگی کا حسین مظہر ہے۔ اسی بنا پر محسنِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے حیا کو نصف ایمان سے تعبیر کیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہماری ثقافت میں عورت محبّت وطمانیت، شرم وحیا، عفّت وطہارت اور عصمت وخودداری کی ایک زندہ علامت ہے۔

خوشبو بھی ہماری ثقافت میں بڑی اہمیت کی حامل رہی ہے۔ خوشبو کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ یہ جمالیاتی ذوق میں لطافت و بوقلمونی اور وسعت وگہرائی پیدا کرتی ہے۔ مختصر یہ کہ خوشبو باطنی ماحول کی طرح ظاہری ماحول کو بھی پاکیزہ، مسرت انگیز، روح افزا اور لذّت آفریں بناتی ہے۔

جہاں تک اہلِ ذوق وصفا کا تعلق ہے۔ وہ خوشبو کا استعمال اس کے دیگر فوائد کے علاوہ اس لیے بھی کرتے رہے ہیں کہ اس سے ان کی جمالیاتی حس میں مختلف قسم کے انوار وتجلیات میں امتیاز کرنے کی صلاحیت نشوونما پاتی رہتی ہے۔ خوشبوؤں کے استعمال سے افکار وتصورات میں بوقلمونی و لطافت اور موزونی وحسن پیدا ہوتا ہے۔ الغرض خوشبو سے محبت اور اس کا استعمال احترامِ سنّتِ نبویؐ بھی ہے اور احترامِ ثقافت بھی۔

حُسن کا تیسرا مظہر نماز ہے جس کے متعلق نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "وہ میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے" اس ارشادِ حکیمانہ میں ایک بڑا ہی لطیف واہم نکتہ مضمر ہے۔ محبوبِ خدا نے یہ نہیں فرمایا کہ "نماز قلب کی ٹھنڈک ہے" بلکہ فرمایا آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔ وجہ یہ ہے کہ نماز میں "دوست کی دید" میسّر آتی ہے اور نظرِ حُسنِ دوست کے نظارے سے ہمہ تن حسن وسرور بن جاتی ہے۔ اس کیفیت کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے "قرۃ عینی" یعنی میری آنکھوں کی ٹھنڈک سے تعبیر فرمایا ہے۔ اصل یہ ہے کہ یہ "دیدِ دوست" مقصودِ حیات بھی ہے اور حاصلِ زندگانی بھی۔ اسی میں "احسان" کی حقیقت مضمر ہے۔ یہ ہے فلسفۂ حیات کا ماحصل، جسے

مولانا روم نے اس طرح بیان کیا ہے:

آدمی دید است باقی پوست است ــــــ دید آن باشد کہ دید دوست است
جملہ تن را در گداز اندر بصر ــــــ در نظر رو، در نظر رو، در نظر

اجتہاد

ثقافت کا چوتھا اہم عنصر اجتہاد ہے جو ثقافت کو جمود و تعطل اور انحطاط و تنزل سے بچانے اور اسے حرکی و ارتقائی رکھنے کے لیے ناگزیر ہے۔ اس سے اجتہاد کی غیر معمولی اہمیت ثابت ہوتی ہے۔ ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ علم و فن میں بالخصوص اجتہاد کے بغیر کمال نہیں حاصل ہو سکتا اور کمال کسی ایسے نقطۂ عروج کا نام نہیں جو منتہی ہو، بلکہ کمال حرکی و ارتقائی ہوتا ہے کیونکہ ہر کمال کے بعد ایک نیا کمال ہوتا ہے اور یہ لامتناہی ہے۔ آیت قرآنی: كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ (الرحمٰن ۵۵: ۲۹) اسی حقیقت کی آئینہ دار ہے۔

وائٹ ہیڈ نے یونانی، بازنطینی اور چینی جیسی عظیم الشان ثقافتوں کے عروج و زوال پر محققانہ نظر ڈال کر یہ ثابت کیا ہے کہ رائے کی ناہم آہنگی یا اختلاف حرکی و ارتقائی کمال کے لیے ناگزیر ہے۔ یہ حکیمانہ نکتہ جسے وائٹ ہیڈ نے چودہویں صدی ہجری میں بیان کیا ہے، پیغمبر اعظم و آخر نے ساتویں صدی ہجری میں فرمایا تھا۔ آپ کی حدیث طیبہ ہے: اختلاف امتی رحمۃ (البیہقی) اس کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ اگر اختلاف رائے نہ ہو تو ہر ثقافت کمال پر پہنچ کر ارفع کمالات کی آرزو یا جذبۂ اجتہاد سے محروم ہو جاتی ہے۔ جس کے سبب اس میں انحطاط و تنزل شروع ہو جاتا ہے۔ یہ ایک فطری امر ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ کوئی ثقافت جامد نہیں رہ سکتی کیونکہ وہ یا تو کمال کی طرف ترقی کرے گی یا اس کا زوال کی طرف ہبوط ہوگا۔ لہٰذا ثقافت کی بقا و دوام کے لیے اجتہاد یا نو بنو کمال کی طلب و جستجو ناگزیر ہے اور نو بنو کمال کی طلب و جستجو کے عمل پیہم ہی میں احترام اجتہاد و ثقافت کا راز مضمر ہے۔

صداقت

صداقت بھی ثقافت کا عنصر ہے اور حق کی طرح ایک قسم کا حسن ہے۔ وجہ یہ ہے کہ حق کا اظہار جو حسین ہوتا ہے، صداقت کہلاتا ہے۔ صدق اور حسن ایک دوسرے کو لازم و ملزوم ہیں۔ صدق ہو تو انسان حسن و حق کی تصدیق کرتا ہے اور صدیق کہلاتا ہے اور صدیق کا مقام جیسا کہ آپ جانتے

ہیں۔ انبیا علیہم السلام کے بعد ارفع ترین مقام ہے۔ ثقافت کا کوئی گوشہ ہو صداقت کے بھرپور اظہار ہی سے حسن و کمال میں اضافہ ہوتا ہے۔

فن

فن بھی ثقافت کا عنصر ہے۔ لوگ عام طور پر ثقافت کو غلطی سے فنی سرگرمیوں ہی تک محدود سمجھتے ہیں۔ فن اتنا وسیع موضوع ہے کہ اس کے متعلق صرف اس قدر کہہ دینا کافی ہو گا کہ انسان کی فنی تخلیق کو احسن الخالقین یعنی اللہ تعالیٰ کی فنی تخلیق کی طرح حسین اور تخلیق بالحق ہونا چاہیے اور جیسا کہ آپ جانتے ہیں اللہ تعالیٰ کی ہر تخلیق حسین ہے۔ مثلاً ارشاد باری تعالیٰ ہوتا ہے: اَلَّذِیْٓ اَحْسَنَ کُلَّ شَیْءٍ خَلَقَهٗ (السجدۃ ۳۲: ۷) یعنی وہ اللہ ہے جس نے جو چیز پیدا کی اسے حسین بنایا۔ دوسری جگہ فرمایا: خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَصَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ (التغابن ۶۴: ۳): یعنی ہم نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا اور تمھاری صورت گری کی تو کیا ہی حسین تمھاری صورت بنائی۔ اور اسی کی طرف سب کو رجوع کرنا ہے۔

تخلیق بالحق یا حق کے ساتھ پیدا کرنے کا مطلب یہ ہے کہ تخلیقی فعلیت میں صداقت اور افادی مقصدیت ہونی چاہیے۔ ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ افادیت اور مقصدیت سے مراد محض مادی فائدہ نہیں۔ چنانچہ ہر فنی تخلیق جو جمالیاتی ذوق کی تسکین کرتی، انسانی ہنر کی عظمت اور فطرت کے جمال و جلال کا احساس و شعور پیدا کرتی ہے، افادیت و مقصدیت رکھتی ہے۔ حاصل کلام یہ کہ ہمارا فن حسن، جذبۂ صداقت، افادیت اور مقصدیت کا آئینہ دار ہونا چاہیے۔

علم و حکمت

آخر میں مجھے ثقافت کے از بس اہم عنصر علم و حکمت کے متعلق صرف اتنا ہی عرض کرنا ہے کہ علم کا سرچشمہ وحی و تنزیل ہے، خصوصاً آخری وحی و تنزیل جسے قرآن مجید کہتے ہیں۔ لہٰذا ہماری عقل و فکر کا مرشد اوّل و آخر زندہ خدا کی یہ زندہ کتاب ہے جو زندگی کے ہر شعبے اور ہر زمان و مکان میں انسان کے لیے نور و ہدایت ہے۔ علم چونکہ خلقت کائنات کے تمام ظاہری و باطنی پہلوؤں کو محیط ہے، لہٰذا اس میں دینی اور دنیوی تقسیم ناجائز، ناروا اور غیر فطری ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ جب سے ہم نے علم کو دین اور دنیا میں تقسیم کیا ہے، ہماری ثقافت علم کی قوت سے جسے قرآن حکیم "سلطان"

سے تعبیر کرتا ہے محروم ہو گئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہماری ثقافت کی پس ماندگی اور حسن و قوت سے محرومی کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہم نے کلیسا کی طرح علم کو دینی اور دنیوی شعبوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ حالانکہ ہمارا عقیدہ اور ایمان ہے کہ دین کل زندگی کو محیط ہے اور اس میں تفریق کرنا حرام ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اسلامی ثقافت میں "لہو الحدیث" کی کوئی گنجائش نہیں۔ "لہو الحدیث" قرآنی اصطلاح ہے جس سے مراد ایسا کلام ہے جو حسن و صداقت سے عاری اور گمراہ کن ہو۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَشْتَرِي لَهْوَ الْحَدِيثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَيَتَّخِذَهَا هُزُوًا ۚ أُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُهِينٌ ٥ (لقمٰن ۳۱ : ۶) "اور ایک وہ لوگ ہیں جو بے مقصد، لایعنی اور گمراہ کن باتیں خریدتے ہیں تاکہ بغیر جانے بوجھے لوگوں کو اللہ تعالےٰ کے راستے سے گمراہ کریں اور اس (یعنی علم و حکمت کے سرچشمے قرآن حکیم) کا مذاق اڑائیں، ایسے ہی لوگوں کے لیے رسوا کن عذاب ہے۔"

لہذا ثقافت کا تقاضا یہ ہے کہ ہم حسین و پاکیزہ اور نافع و بامقصد لٹریچر سے اپنی ثقافت کے حسن، قوت اور سطوت میں اضافہ کریں، اور اسے "لہو الحدیث" سے محفوظ رکھیں۔ اگر میں یہ کہوں کہ ایسے ہی گمراہ کن لٹریچر نے ہم میں تشتت و افتراق پیدا کر کے ہماری قومیت کا شیرازہ منتشر کر دیا ہے اور ہماری نژادِ نو کو اسلامی معتقدات و تصورات اور روایات و اقدار اور نظریۂ پاکستان سے بیگانہ کر دیا ہے تو یہ مبالغہ نہیں حقیقت کا اعتراف ہوگا۔

مجمع البحرین : مولانا محمد جعفر شاہ پھلواروی

یہ کتاب وحدتِ اُمّت کی طرف ایک اہم قدم ہے۔ اس میں شیعہ و سنی کی متفق علیہ روایات کو پیش کیا گیا ہے۔ شروع میں علامہ مفتی جعفر حسین قبلہ مجتہد کا تعارف و تبصرہ اور علامہ سیّد نصیر الاجتہادی کی تقریظ ہے۔

صفحات : ۲۸+۲۲۲ قیمت : ۶ روپے

ملنے کا پتہ

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور